رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

از

جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی۔اے ہوم ڈپارٹمنٹ نئی دہلی

[ابتداءً جب تعلیمات قرآن پر نقد کیا گیا تھا اس وقت بحث کو زیادہ طول دینے کا خیال نہ تھا۔ اس لئے صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا۔ پھر مولانا اسلم جیراج پوری کے جواب پر نظر کرتے ہوئے ذرا تفصیل سے کام لینا پڑا۔ مگر اب جناب پرویز نے ایک مفصل مضمون لکھ کر دعوت دی ہے کہ ان تمام مسائل پر وضاحت کے ساتھ بحث کی جائے جو تعلیمات قرآن پر تنقید کے سلسلہ میں چھڑ گئے تھے۔ چوہدری صاحب کا مضمون کافی طویل ہے۔ اور جواب اس سے بھی زیادہ طویل ہوتا نظر آتا ہے۔ لہذا ان کے مضمون کو باقساط شائع کیا جائے گا اور ہر قسط کا جواب بھی ساتھ ساتھ درج ہوگا۔ اگرچہ یہ بحث طویل ہے لیکن اُمید ہے کہ ناظرین اس کو دلچسپ اور مفید پائینگے۔ ایڈیٹر]

بحث و نظر میں مقصود اگر تحقیق حق ہو اور روش میں رہے متانت و سنجیدگی تو ایسے اختلافات فی الواقع رحمت کے موجب ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون (مطبوعہ ترجمان القرآن بابتہ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ) میں تعلیمات قرآن کا اجمالی سا تعارف کرایا تھا کہ میرے پیش نظر محض اس اسلوب کو نمایاں کرنا تھا جس کے مطابق ہمیں قرآن کریم کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ آپ (مدیر ترجمان) نے اس پر استیعاباً تبصرہ فرمایا۔ چنانچہ آپ کی تنقید۔ صاحب تعلیمات کے جواب اور پھر آپ کی تنقید پر جواب

بہت سے ایسے مباحث سامنے آگئے جن سے قلوب سلیم نے کافی استفاضہ کیا اور ایسے ہی ہیں وہ اختلافات جنہیں رحمت کہا جاتا ہے۔ ورنہ ہندوستان کی عام علمی فضا میں بالعموم اور مذہبی حلقوں میں بالخصوص اختلاف و مخالفت میں کوئی فرق ہی نہیں کیا جاتا اور بحث کا طریقہ بالکل ایسا ہو جاتا ہے گویا بچے کنکوؤں پر لڑ رہے ہیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ترجمان نے اس باب میں نہایت سنجیدہ روش کا ثبوت دیا ہے۔

میں نے اس بحث کو دلچسپی سے پڑھا ہے معلوم نہیں کہ صاحب تعلیمات اب آپ کی تنقید برجواب کے بعد پھر کچھ تحریر فرمائینگے یا نہیں۔ ان کے سابق طرز عمل سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ بحث و مجادلہ میں طوالت کو پسند نہیں فرماتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر یہ بحث یوں ہی چھوڑ دی گئی تو اس کے متعدد گوشے تشنہ تکمیل رہ جائیں گے۔ لہذا میں نے جسارت کی ہے کہ ایسے مقامات جن سے کم از کم میں ابھی تک مطمئن نہیں ہو سکا۔ ترجمان کے صفحات پر پھیلا دوں تاکہ مزید تفحص و تدبر میرے اور میرے جیسے دیگر قلوب کے لئے اطمینان و ایقان کا موجب ہو سکے۔ ان فی ذالک لاٰیٰت لاولی الابصار۔

جن و انس جنوں کے متعلق قرآن کریم میں یہ صراحت موجود ہے کہ وہ آتشیں مخلوق ہیں۔ انسانوں سے بالکل الگ، اس میں کسی شبہ یا اختلاف کے گنجائش نہیں۔ البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے معماروں، غوطہ خوروں اور غوطہ خوروں کے متعلق تعلیمات قرآن میں یہ حاشیہ دیا گیا ہے کہ "خیال ہو سکتا ہے کہ وہ انسانوں کا ایک طبقہ ہے"۔ اس کے خلاف ترجمان نے دو وجہیں بیان کی ہیں۔

(۱) غیر مادی مخلوق کو اللہ نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ بشری شکل میں متشکل ہوں اور مرئی و محسوس بن جائیں۔ چنانچہ فرشتے حضرت ابراہیمؑ و حضرت لوطؑ اور حضرت مریمؑ کے سامنے انسانی شکل میں متمثل ہوئے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اُس سے آپ نے جو نتیجہ مستنبط فرمایا ہے کہ جن بھی بشری شکل میں متمثل ہو سکتے ہیں۔ یہ کیسے ثابت ہو گیا۔ اول تو حیرت ہے کہ جنوں کو آپ نے غیر مادی کیسے قرار دے دیا حالانکہ اُن کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ اور آگ مادہ ہے۔ اور عناصر اربعہ مادیہ میں سے ایک عنصر۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے اُن کو غیر مرئی بتایا ہے۔

اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷: ۲۷)	حقیقت یہ ہے کہ وہ (ابلیس) اور اُس کا قبیلہ تم کو وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم اُس کو نہیں دیکھتے

اس لئے قرآن پاک کی اس شہادت کے خلاف، محض فرشتوں کے پیکر بدلنے پر جنوں کو مرئی خیال کرنا جس کی کوئی مثال، مثل تبدیل پیکر فرشتگان، قرآن نے نہیں دی، درست نہیں ہو گا۔ لہٰذا جب تک جنوں کا مرئی ہونا ثابت نہ ہو جائے، جنود سلیمانی کی مرئی و محسوس ہستیوں کو آتشیں جن ماننے کا قیاس مرجح نہیں ہو سکتا۔

(۲) دوسری وجہ یہ لکھی گئی ہے کہ ملکۂ سبا کے تخت حاضر کر دینے کا جس نے دعوے کیا تھا وہ آتشیں جن تھا۔ کیوں کہ انسان اس پر قادر نہیں کہ ایک گھڑی بھر کے عرصہ میں اتنے فاصلہ سے تخت لا سکے۔

لیکن انسان کے عدم قدرت کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے دراں حالیکہ قرآن کریم کے تمام شارحین اس شخص کو جس نے ملکۂ سبا کا تخت ایک لمحے میں منگا دیا تھا، جن نہیں قرار دیتے، انسان ہی قرار دیتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ (۲۷: ۳)	اور اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہا کہ میں اس تخت کو آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے لا دونگا

اگر طرفۃ العین میں تخت لا دینے والا انسان ہو سکتا ہے تو گھڑی بھر میں لانے والا انسان کیوں نہیں ہو سکتا۔

ان توجیہات کی روشنی میں کیا آپ اس پر مزید غور فرمائینگے؟ اتنا اور بھی گذارش کردوں کہ اگرچہ صاحب تعلیمات نے اپنے جواب میں شیطان اور ابلیس کے فرق کو واضح کر کے یہ بتایا تھا کہ ابلیس یقیناً جن ہے لیکن چونکہ ہر شیطان ابلیس نہیں، اس لئے ہر شیطان جن بھی نہیں۔ شیاطین کا لفظ قرآن کریم میں انسانوں کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے۔ لیکن آپ اپنی تنقید مزید میں "والشیاطین کل بناء وغواص" کے ترجمہ میں شیاطین (یا جن) لکھ کر مفہوم پھر جنوں کے متعلق لے گئے ہیں۔ اگر ان شیاطین کو ہم انسان ہی مان لیں تو ان کے مرئی ہونے کی وجہ سے کیا یہ خیال قرآن کریم سے زیادہ قریب نہیں ہوگا؟ (باقی)

الجواب

حقیقت جن "جن" کی حقیقت کے متعلق شبہات کی ابتدا دور جدید میں غالباً انیسویں صدی کے وسط آخر میں ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں محض کسی مذہبی کتاب کی سند پر کسی ایسی شئے کو موجود ماننا جس کے وجود کا کوئی سائنٹفک ثبوت موجود نہ ہو بڑے شرم کی بات ہو گئی تھی، اور ایسی شرمناک بات کا ارتکاب صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو اس زمانہ کے اہل علم کی نگاہوں میں تاریک خیال اور توہم پرست کٹھ ملا بننے کے لئے تیار ہوتا۔ ان حالات میں اُن مسلمانوں نے جو اپنی دنیوی ترقی کے لئے اپنے غیر مسلم آقاؤں اور پیشواؤں کی نگاہوں میں روشن خیال اور عقل پرست بننا ضروری سمجھتے تھے ایک نئی نگاہ سے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا، اور ہر اس مسئلہ کو جسے ماننے کے لئے

انیسویں صدی کے مادہ پرست بندگان حواس و پرستارانِ عادت آمادہ نہ ہو سکتے تھے ایسے عجیب طریقوں سے تاویل کے خراد پر چڑھایا کہ وہ مسئلہ قرآن سے خارج بھی نہ ہوا اور اُن لوگوں کے افکار و تخیلات کے مطابق ڈھل بھی گیا جو قرآن کی روح اور اس کے اصولِ اولیہ سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں جن قرآنی ارشادات کو توڑا مروڑا گیا انہی میں سے ایک وہ ارشادات ہیں جو ابلیس، شیاطین، اور جنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا گیا کہ ان الفاظ سے کوئی ایسی مخلوق مراد نہیں ہے جو انسان سے الگ کوئی فوق الطبیعی وجود رکھتی ہو، بلکہ اُن سے کہیں تو انسان کی اپنی بہیمی قوتیں مراد ہیں، جنہیں شیاطین کہا گیا ہے، اور کہیں ان سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں، اور کہیں اُن سے وہ لوگ مراد ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن مجید سنا کرتے تھے۔ یہ تاویلات اتنی کریک ہیں کہ اُن کا ارتکاب صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو عربی زبان اور قرآن مجید کا تھوڑا سا علم بھی نہ رکھتا ہو، یا پھر اس کے دل میں خدا اور یوم آخر کے خوف سے زیادہ دنیا اور اہل دنیا کا خوف ہو۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جن حالات سے ہندوستان کے مسلمان گزرے ہیں ان میں یہ دونوں باتیں جمع ہو گئی تھیں، اس لئے ایسی اور اس سے بھی زیادہ رکیک تاویلات قرآن مجید میں کی گئیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ ادّعائے علم و حمایت اسلام کے ساتھ کی گئیں!

جس طرح انسان پر بہت سے دور گذر چکے ہیں اسی طرح یہ دور بھی گزر گیا۔ اب خود یورپ میں بھی ایک بڑا گروہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو روحانیت کا قائل ہے، اور اس محسوس و مرئی دنیا کے علاوہ ایک ایسے عالم کے وجود کو بھی مانتا ہے جو ہمارے حواس سے پوشیدہ ہے۔ اس لیے اب جن اور شیاطین کے مستقل وجود کو تسلیم کرنا اتنا خطرناک نہیں رہا ہے جتنا اب سے بیس پچیس برس پہلے تھا۔ تاہم ابھی اس دور کے اثرات بالکل زائل نہیں ہوئے ہیں، اور ابھی تک محض قرآن کی سند پر کسی ایسی بات کو ماننے سے دماغ انکار کر رہے ہیں جو فوق الطبیعی ہونے کے ساتھ خارق عادت

بھی ہو۔ یہ اسی دور کے بچے کھچے اثرات تھے جو "تعلیمات قرآن" میں ہم کو نظر آئے۔ مولانا اسلم جیراج پوری قرآن کے صریح ارشادات کو دیکھ کر یہ تو ماننے پر مجبور ہو گئے کہ "جن" سے مراد ایک آتشیں مخلوق ہے جو انسان سے علٰحدہ وجود رکھتی ہے۔ لیکن قرآن میں جگہ جگہ جنوں کی طرف جو امور منسوب کیے گئے ہیں، وہ چونکہ خارق عادت ہیں، اور اُن کو بعینہٖ اس طرح ماننا جس طرح قرآن میں وہ بیان ہوئے ہیں، اقتضائے عقلیت کے خلاف محسوس ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے کسی نہ کسی طرح تاویل کر کے جنوں کی دو قسمیں قرار دے لیں۔ ایک وہ مخصوص نوع کی مخلوق جو ناری الوجود ہے اور انسان سے اصلاً مختلف ہے۔ دوسرے انسانوں کا کوئی خاص طبقہ جس کے متعلق وہ خود جانتے ہیں نہ کسی حوالہ سے بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سا طبقہ ہے اور کس بنا پر "جن" کے نام سے موسوم ہو گیا؟

ہمارے دوست چوہدری غلام احمد صاحب پرویز الحمد للہ ان اثرات سے محفوظ ہیں مگر پھر بھی ایک مقام پر ان کو "جن" کے انسان ہونے کا شبہ ہو ہی گیا۔ وہ مولانا اسلم جیراج پوری کے اس خیال سے تو متفق نہیں ہیں کہ "قرآن مجید میں جہاں جہاں جن اور انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد آتشیں جن نہیں بلکہ انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے"۔ لیکن خاص کر حضرت سلیمان کے جنوں پر ان کو بھی شبہ ہے کہ وہ انسان ہی تھے آتشیں نہ تھے، کیوں کہ نظر آتے تھے اور انسانوں کی طرح غوطے لگاتے اور برتن بناتے تھے۔

ایک قاعدہ اس مسئلہ کی تحقیق میں آگے قدم بڑھانے سے پہلے ایک قاعدہ ذہن نشین کر لیجیے۔ اللہ تعالیٰ جب اپنی معلومات میں سے کسی ایسی شئے کو جو ہمارے دائرۂ علم و ادراک سے خارج ہے، ہمارے علم میں لانا چاہتا ہے، تو لامحالہ وہ اس شئے کو ہماری زبان کے کسی ایسے ہی لفظ سے تعبیر کرتا ہے جس کو ہم نے اس معلوم الٰہی کے ساتھ قریب تر مناسبت رکھنے والی کسی چیز کے لئے وضع

کیا تھا تاکہ ہم اُس شئے کا کسی حد تک صحیح تصور کر سکیں جو اللہ کے علم میں ہے اور ہمارے علم میں نہیں ہے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ حق تعالیٰ کسی چیز کو یونہی کسی مناسبت اور ربط معنوی کے بغیر کسی خاص لفظ سے موسوم کر دے درانحالیکہ اس چیز کے لیے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر اُس خاص لفظ کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جس چیز کو "جنت" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لیے لفظ "جنت" بمقابلہ "جہنم" کے اولیٰ نہ ہوتا اور جس چیز کو "نور" سے تعبیر کیا گیا ہے اُس کے لیے "نار" کا استعمال بھی اسی طرح جائز ہوتا۔

"جن" کی لغوی تحقیق

اس قاعدہ کے مطابق ہم کو سب سے پہلے لفظ "جن" کی تحقیق کرنی چاہیے کہ کلام عرب میں اس کو کس معنی کے لیے وضع کیا گیا تھا اور حق تعالیٰ نے جو اس کو اپنی ایک خاص مخلوق کے لیے دوسرے الفاظ کے مقابلہ میں ترجیح دی تو کس مناسبت کی بنا پر دی۔

"جن" کا مادہ ج ن ن ہے۔ اس مادہ کا مرکزی تصور "پوشیدگی" ہے اور اس کے تمام مشتقات میں کسی نہ کسی طور پر یہ تصور ضرور پایا جاتا ہے اصل الجن ستر الشئ من الحاسہ۔ (راغب) کل شئ سترعنک فقد جنّ عنک (جمہرۃ ابن درید و لسان العرب)۔

اسی بنا پر جنان ہر چیز کے جوف کو کہتے ہیں جو نظر نہیں آتا روح کو جنان اسلیے کہتے ہیں کہ جسم اسکو چھپائے ہوئے ہے۔ دل کو جنان اسلیے کہتے ہیں کہ وہ صندوق سینہ میں مستور ہے۔ حریم خانہ کو جنان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ چہار دیواری سے چھپا ہوا ہے۔ باغ کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ درختوں کے جھنڈ اس کی زمین کو چھپا لیتے ہیں۔ اگر باغ میں یہ صفت نہ ہو تو اس کو جنت نہیں کہہ سکتے۔ بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہے جنین ہے۔ رحم کو بھی جنین کہتے ہیں۔ میت جب دفن کر دی جائے تو وہ بھی جنین ہے۔ حتیٰ کہ ہر چیز جو چھپی ہوئی ہے اس پر جنین کا اطلاق ہوگا۔ چنانچہ چھپے ہوئے کینے کو حقد جنین کہا گیا ہے۔ قبر کو جنن کہتے ہیں۔ کفن کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ دفن کرنے کے لیے اِجنان کا لفظ آتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے

ولی دفنہ صلے اللہ علیہ وسلم واجنانہٗ علی والعباس۔ پردے اور آڑ کو جُنّۃ کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے اتخذوا ایمانھم جنّۃً "انہوں نے اپنی قسموں کو اس نفاق کے لیے پردہ بنالیا ہے جو وہ اپنے دلوں میں لیے ہوئے ہیں"۔ جنہ وجن علیہ، چھپالیا اس کو۔ چنانچہ قرآن میں ہے فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ جب رات کی تاریکی اس پر چھا گئی۔

اِجنان کے معنی چھپا دینا اور استجنان کے معنی چھپ جانا۔ جنّ اللیل وجنان اللیل وجنون اللیل رات کی شدید تاریکی جو پردہ پوش ہوتی ہے۔ چنانچہ دُرید بن الصمہ کہتا ہے

ولولا جنون اللیل ادرک رکضنا

اور ہذلی کہتا ہے۔

حتی یجیئ وجن اللیل یوغلہ

راز اور پوشیدگی کو بھی جن کہتے ہیں۔ مثل ہے لاجن بھذا الامر یعنی اس معاملہ میں کوئی راز نہیں ہے۔ جنّ الناس اور جنانُ الناس آدمیوں کی اُس بھیڑ کو کہتے ہیں جس میں اگر کوئی آدمی گھر جائے تو پتہ نہ چل سکے کہ کہاں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن کے نام سے جس نوع مخلوقات کو موسوم کیا جائیگا وہ لازمی طور پر غیر محسوس یا کم از کم مستور ہونی چاہیے۔ جس مخلوق میں مستوری کی صفت نہ پائی جائے اُس کو اس نام سے کبھی موسوم نہ کیا جائیگا۔ تمام اکابر اہل لغت نے بالاتفاق یہی بات جنوں کی وجہ تسمیہ میں لکھی ہے۔ چنانچہ جمہرۂ ابن درید مفردات امام راغب صحاح قاموس لسان العرب تاج العروس غرض عربی زبان کی کسی مستند لغت کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ سب میں یہی لکھا ملیگا کہ "جن" اس نام سے اس لیے موسوم ہوئے کہ وہ نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔

کلام عرب کی شہادت لغت کے بعد کلام عرب پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے

بطور خود یہ کوئی نئی اصطلاح وضع نہیں کی تھی۔ بلکہ اہل عرب پہلے سے ایک ایسی فوق الطبیعی مخلوق کو جن کے نام سے یاد کرتے تھے جو بالاصل غیر مرئی و غیر محسوس تھی، مگر کبھی کبھی ان کو مختلف شکلوں میں نظر آتی تھی، اور جس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ غیر معمولی افعال پر قادر ہے، اور عالم طبیعت و اجسام پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خاص خاص مقامات پر یہ مخلوق قابض ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے مقامات کو وہ ارض مجنۃ کہا کرتے تھے خالی مکانوں کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ ان میں جنوں کا تسلط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو شخص کسی خالی مکان میں رات گذارتا تو اس کو کہتے کہ وہ رات جنوں کا مہمان تھا۔ اخطل کہتا ہے :-

وبتنا کانا ضیف جن بلیلۃ

جہلائے عرب جب کوئی نیا مکان بنواتے تو پہلے وہاں جنوں کے لئے قربانی کرتے تاکہ وہ ساکنینِ مکان کو نہ ستائیں۔ اسی کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ انہ نھی عن ذبائح الجن "یعنی آپ نے جنوں کے لیے قربانی کرنے کی ممانعت کر دی"۔ جب کوئی انسان پاگل ہو جاتا تو یہ لوگ سمجھتے کہ اس پر جن مسلط ہو گیا ہے۔ اسی لیے اس کو مجنون کہتے تھے۔ قرآن مجید میں بھی ان کے اس خیال کو بیان کیا گیا ہے کہ افترٰی علی اللہ کذبا ام بہ جنۃ (۳۴: ۸) جب گائے پانی نہ پیتی تو اس کے نر کو مارا جاتا تھا۔ کیونکہ اعتقاد یہ تھا کہ جن اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ مادہ کو پانی پینے سے روکتا ہے۔ ان کا وہم تھا کہ ایک جن ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کو وہ "تابع" یعنی ہمزاد کہا کرتے تھے۔ ہر غیر معمولی چیز جنوں کی طرف منسوب کی جاتی تھی۔ چنانچہ جو شخص کام میں بہت تیز ہوتا اس کے متعلق وہ سمجھتے کہ جن اس میں سما جاتا ہے۔ اس لئے اس کو جنی (یعنی منسوب بہ جن نہ کہ خود "جن") کہا جاتا تھا۔ ہر شاعر کا ایک خاص "جن" ہوتا تھا اور وہی اس کو شعر کہوایا کرتا تھا۔ جب کسی شخص کا زور ٹوٹ جاتا تو کہتے کہ نفرت جنہٗ

یعنی اس کا جن جس کے زور سے وہ کام کر رہا تھا، بھاگ گیا۔ جو عورت بہت جمیل ہوتی اس کو مجازاً جنّیہ یعنی "پری" کہتے کیونکہ جنّیات کا جمال ان کے نزدیک فوق الانسانی جمال تھا۔ وہ جنوں کی انہی فوق الانسانی صفات اور قدرتوں کی بنا پر خدا سے ان کا نسب ملاتے تھے چنانچہ قرآن میں ہے وجعلوا بینہ وبین الجنۃ نسباً (۳۷: ۲) ان کو عبادت میں شریک کرتے بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَکْثَرُھُمْ بِھِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (۳۴: ۵) وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ شرکاء الجن وخلقھم وخرقوا له بنین وبنٰت بغیر علم (۶: ۱۱) مصیبت اور خوف کے وقت اُن سے پناہ مانگتے تھے کان رجال مّن الانس یعوذون برجالٍ من الجن (۷۲: ۱)۔ وہ ملائکہ کو بھی "جن" کہتے تھے۔ چنانچہ اعشیٰ کا قول ہے :-

وسخر من جن الملائك تسعة قیاما لدیه یعملون بلا اجر

ان کے متعلق جہلائے عرب کا خیال تھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں چنانچہ اس کی طرف متعدد مقامات پر قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِکَۃَ الَّذِیْنَ ھُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (۴۳: ۲) اور اَفَاَصْفٰکُمْ بِالْبَنِیْنَ واتخذ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ اِنَاثًا (۱۷: ۴) ان قوی وکثیر شہادتوں کے مقابلہ میں ایک شہادت بھی کلام عرب سے ایسی نہیں دکھائی جاسکتی جس میں "جن" کا اطلاق حقیقی معنوں میں انسان پر کیا گیا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس کلام عرب سے صریح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ عرب "جن" اور "انس" کو دو مختلف نوع کی مخلوقیں سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر بدر بن عامر کہتا ہے :-

ولقد نطقت قوافیا انسیّةً ولقد نطقتُ قوافی التجنین

اور عمران بن حطان الحروی کہتا ہے :-

قد کنت عندک حولا لا تروعنی فیه روائع من انس ولا جانی

اس کے بعد ائمہ لغت کی متفقہ شہادت ملاحظہ ہو۔ جوہری اپنی کتاب الصحاح میں کہتا ہے :-

اُلجنُ خلافُ الانسِ سُمّیت بذلک لانھا تخفی ولا ترٰی۔ فلا یرون

ابن سیدہ کہتا ہے :- الجن نوعٌ من العالم سُمّوا بذلک لاجتنانھم عن الابصار ولانھم استجنوا من الناس

ابن درید کہتا ہے :- "والجن خلاف الانس"۔

چند مقدمات | یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے چند باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں :-

ایک یہ کہ لغت عرب میں لفظ جن کے وہی معنی ہیں جو ہماری زبان میں "چھپے ہوے" اور "پوشیدہ" کے ہیں اس لفظ کو جب انواع مخلوقات میں سے کسی نوع کے لیے بطور اسم استعمال کیا جائیگا تو ضرور ہے کہ وہ کوئی ایسی نوع ہو جو عادتاً مخفی و مستور ہو حتی کہ اس کا ظاہر اور نمایاں ہونا خرق عادت میں سے شمار کیا جائے نہ یہ کہ وہ عادتاً ظاہر اور نمایاں ہو جیسے انسان۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ لفظ سیّال کا اطلاق ہمیشہ ایسی ہی چیز پر کیا جائیگا جو عادتاً بہنے والی ہو، اور اگر کبھی وہ جامد پائی جائے تو اس کا جمود خلاف معمول شمار کیا جائے (مثلاً پانی) لیکن اگر کوئی شخص لفظ سیال کا اطلاق کسی ایسی چیز پر کرے جو عادتاً جامد ہو (مثلاً پتھر) اور جس کا جامد ہونا نہیں بلکہ سیّال ہونا خلاف معمول ہو تو آپ یقیناً حکم لگادیں گے کہ وہ شخص لفظ سیّال کے معنی سے ناواقف ہے، اور لفظ کو اس کے غیر معنی موضوع لہ میں استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر قرآن مجید میں لفظ "جن" (مخفی و مستور) کا اطلاق کسی ایسی مخلوق پر کیا جاتا جو عادتاً مخفی و مستور نہیں ہے، بلکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے مرئی اور محسوس ہے (مثلاً انسان) تو نعوذ باللہ یہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ اس کتاب کو پیش کرنے والا یا تو مجنون ہے یا لفظ "جن" کے معنی سے ناواقف ہے۔ یقین مانیے کہ ایسی صورت میں خواہ تمام عجم قرآن پر ایمان لے آتا، مگر کوئی عرب تو کبھی اس پر ایمان نہ لاتا، کیوں کہ وہ "جن" کا بطور معجزہ و خرق عادت مرئی و محسوس بن جانا تو مان سکتا ہے، مگر یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ مرئی و محسوس انسان کو "جن" کے لفظ سے تعبیر کیا جائے۔ جس وقت کفار عرب نے کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی عجمی شخص قرآن سکھاتا ہے، تو اپنے اس دعوی کی تائید میں وہ کوئی دلیل پیش نہ کر سکے، اور جب قرآن نے ان کے اس الزام کا یہ جواب دیا کہ لِسَانُ الَّذِی یُلْحِدُونَ اِلَیْہِ

اعجمی وھذا لسان عربی مبین (۱۶ : ۱۰۴)
جس شخص کو یہ سکھانے والا بناتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے حالانکہ قرآن جس زبان میں ہے وہ عربی مبین ہے" تو اس جواب کو سن کر تمام عرب کی زبانیں بند ہوگئی تھیں لیکن اگر کہیں اس وقت کفار عرب کو قرآن میں ایک مثال بھی ایسی مل گئی ہوتی جس میں لفظ "جن" کا اطلاق انسان پر کیا گیا ہوتا تو وہ پلٹ کر جواب دیتے کہ یہ کہاں کی لسان عربی مبین ہے جس میں "جن" کا اطلاق انسان پر کیا جا رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ عرب میں پہلے سے "جن" کا نام ایک ایسی فوق الطبیعی غیر جسمانی مخلوق کے لیے موضوع اور شائع و متعارف تھا جو عادتاً محسوس نہ ہوتی تھی جس کو کبھی کبھی وہ "سعالی" اور "غول" وغیرہ کی شکل میں دیکھتے تھے، اور جس کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ وہ فوق الطبیعی انداز سے ان پر اثر انداز ہوتی ہے پس جب قرآن نے اس شائع شدہ لفظ کو استعمال کیا تو لامحالہ اس کے معنی وہی لیے جائیں گے جن کے لیے وہ پہلے سے وضع کیا ہوا تھا اور شائع تھا۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ "وہ عربی میں اتارا گیا ہے تاکہ عرب جو اس کے اولین مخاطب ہیں اس کو سمجھ سکیں" اِنَّا انزلنٰہ قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون (۱۲ : ۱) یہ دعویٰ اسی صورت میں سچا ہو سکتا تھا کہ قرآن میں وہی الفاظ اور اصطلاحات اور انداز بیان استعمال کیے جاتے جو عرب میں رائج اور معروف تھے، اور اگر اہل عرب کی زبان کے کسی لفظ کو معلوم و متعارف معنی کے سوا کسی خاص معنی میں استعمال کیا جاتا تو وہ اصل لغت کے خلاف نہ ہوتا اور اس خاص معنی کی تشریح کر دی جاتی، کہ عرب اس کو سمجھ سکتے۔ لیکن آپ لفظ "جن" کے جو معنی بیان کرتے ہیں وہ نہ تو اصل لغت کے مطابق ہیں، نہ کلام عرب میں معلوم و متعارف ہیں، اور نہ اُن کی کوئی ایسی تشریح قرآن میں ملتی ہے جس سے واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ اس نام کا وہ مسمّیٰ مراد نہیں ہے جو اہل عرب نزول قرآن کے وقت اس سے مراد لیتے تھے۔ کیا یہ بات قرآن کے اس دعوی کی تکذیب کو متضمن نہیں ہے

تیسرے قرآن میں جگہ جگہ عربوں کے اس اعتقاد باطل کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جن اور ملائکہ کو خدائی میں شریک کرتے خدا سے ان کا نسب جوڑتے ان سے پناہ مانگتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ پھر اس اعتقاد کا ابطال اس طرح کیا گیا ہے کہ "جن" خدا کے شریک نہیں ہیں نہ اس کی اولاد ہیں بلکہ وہ بھی اسی طرح کی ایک مخلوق ہیں جس طرح انسان اس کی مخلوق ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان مٹی کے ست سے پیدا کیا گیا ہے اور "جن" آگ کی بھونک سے۔ مگر احکام خداوندی کے مخاطب دونوں ہیں خدا کے سامنے جواب دہ ہونے میں دونوں برابر کے شریک ہیں اور نافرمانی کی سزا دونوں کے لیے یکساں ہے۔ پس انسان کا ان کی عبادت کرنا محض ایک جاہلانہ فعل ہے۔ بلکہ اس میں انسان کے لیے ذلت بھی ہے اس لیے کہ انسان ایک بالاتر نوع ہے جنوں کے نمائندے ابلیس کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا اور انکار کرنے پر راندۂ درگاہ کیا گیا انسان کو رسالت کے بلند منصب پر سرفراز کیا گیا اور جنوں کو اس کے ذریعہ سے ہدایت دی گئی واذ صرفنا الیک نفرا من الجن الایہ (۴۶ : ۴) قل اوحی الی انہ استمع نفر من الجن (۷۲ : ۱) انسانوں ہی میں سے ایک برگزیدہ ہستی (سلیمان علیہ السلام) کو یہ شرف عطا ہوا کہ جن اس کے تابع کیے گئے۔ یہ تمام باتیں عربوں کے ان اعتقادات باطلہ کی تردید اسی صورت میں ہو سکتی ہیں جبکہ ان میں "جن" سے مراد وہی مخلوق ہو جس کو وہ خدائی میں شریک اور عبادت میں خدا کا ساجھی بناتے تھے لیکن اگر ان میں جن سے مراد انسان ہوں تو پھر کسی طرح بھی ان اوہام کا ابطال کرنے والی نہ ہونگی اور عربوں کے وہ اعتقادات اپنی جگہ پر رہیں گے جو وہ اپنے متصور جنوں کے متعلق رکھتے تھے۔

چوتھے اگر "جنوں" کے ذکر سے کسی خاص مقام یا بعض مخصوص مقامات پر قرآن کا مقصود دراصل انسانوں یا ان کے کسی خاص گروہ کا ذکر کرنا تھا تو ان کو لفظ "جن" سے تعبیر کرنے کے لیے کونسی ضرورت داعی ہوئی تھی؟ کیوں نہ ان کو لفظ انسان ہی سے تعبیر کیا گیا؟ خواہ مخواہ ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کیا حاجت پیش آئی تھی جن سے ناری جن اور خاکی جن کے درمیان التباس واقع ہوتا؟ یہ وہ

بات ہے جس کو ہمارے زمانے کے اکثر اہل تاویل قرآنی الفاظ کے معنی بیان کرتے وقت نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ اس پہلو پر کبھی غور نہیں کرتے کہ جب کسی خاص معنی کو بیان کرنے کے لیے معروف اور شائع الفاظ موجود ہیں اور خود قرآن نے بھی اس معنی کو بیان کرنے کے لیے جب موقع وہی الفاظ استعمال کیے ہیں، تو آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ کسی خاص مقام پر اسی معنی کو بیان کرنے کے لیے (اگر واقع میں اس کا مقصود وہاں وہی معنی بیان کرنا ہو) بعض دوسرے الفاظ استعمال کرتا دراں حالیکہ وہ الفاظ اس معنی کے لیے شائع اور متعارف نہ تھے اور نہ ہیں۔ مثال کے طور پر اگر واقعہ یہی تھا کہ حضرت سلیمانؑ کو مصر سے یا دوسرے مقامات سے اعلیٰ درجہ کے غواص، ظروف ساز، معمار اور سنگ تراش آدمی فراہم کر کے دیے گئے تھے تو یہی کہہ دینے میں کونسا امر مانع تھا کہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کو ایسے اور ایسے آدمی فراہم کر دیے تھے۔ کیا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود نہ تھا کہ مجبوراً اس کو "جن" اور "شیاطین" کے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا خود اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کا ذکر کرنے کے مواقع پر ان کو انسان یا بنی آدم کے الفاظ سے تعبیر نہیں کیا ہے؟ اور اگر ان خاص آدمیوں میں کوئی خصوصیت ایسی تھی کہ اس کو "جن" اور "شیاطین" کے استعاروں میں ادا کرنا ضروری تھا تب بھی اس تصریح میں کیا چیز مانع تھی کہ یہ "جن" بنی آدم سے تھے؟

قرآن میں معنی جن کی تصریح

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب دیکھیے کہ قرآن مجید نے لفظ "جن" کو کس معنی میں استعمال کیا ہے۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں "جن" اور "انسان" کی حقیقتیں الگ الگ بیان کی گئی ہیں، اور بالفاظ صریح ایک جگہ نہیں، متعدد جگہ بتایا گیا ہے کہ "جن" ایک ناری الاصل مخلوق ہے اور "انسان" ارضی الاصل ہے۔ لفظ "جن" کو استعمال کرنے کے ساتھ جب اس کے معنی کی یہ تصریح بھی خود قرآن ہی نے کر دی ہے تو عقل یہ چاہتی ہے کہ جہاں کہیں وہ لفظ استعمال ہو، وہاں اس کے وہی معنی لیے جائیں جن کی تصریح

کی جا چکی ہے[1]۔ اس کے خلاف کوئی اور معنی لینے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو اس دوسرے معنی کی بھی کوئی ویسی ہی تصریح قرآن میں موجود ہو، یا پھر آپ کے پاس ایسے قوی دلائل ہوں جن کی بنا پر قرآن کی تصریح کے خلاف معنی میں اس لفظ کو لینا جائز ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو براہ کرم کوئی ایک ہی آیت ایسی پیش فرمائیے جس میں "جن" بہ معنی "انسان" کی ویسی ہی تصریح ہو جیسی کہ "جن" بہ معنی "مخلوق آتشیں" کی تصریح ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم کو حق ہے کہ آپ کے دلائل کا جائزہ لیکر دیکھیں کہ آیا وہ اس حد تک قوی ہیں کہ قرآن نے "جن" کے جس معنی کی تصریح کی ہے اُس کو چھوڑ کر آپ کے تجویز کردہ معنی کو قبول کیا جائے؟

جن بہ معنی انسان کی پہلی دلیل

مولانا اسلم جیراج پوری نے جس بنا پر "جن" کے انسان ہونے کا گمان کیا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:-

> "جن کا لفظ قرآن میں صرف مکی سورتوں میں آیا ہے۔ مدنی سورتوں میں کہیں نہیں آیا۔ اور انس کا لفظ بلا جن کے سارے قرآن میں کہیں مستعمل نہیں ہوا ہے۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ جن و انس کے الفاظ جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں۔"

میں پوچھتا ہوں کیا یہ کوئی دلیل ہے؟ کسی سورت کے مکی یا مدنی ہونے اور جن کے ساتھ انس کا لفظ آنے یا نہ آنے کو لفظ "جن" کے معنی میں آخر کس قسم کا دخل حاصل ہے؟ آپ ان تمام آیتوں کو

---

[1] بلاشبہ قرآن میں دو جگہ "جان" کا لفظ "سانپ" کے معنی میں بھی آیا ہے، لیکن اول تو خود قرآن ہی میں دوسری جگہ اس چیز کیلئے ثعبان اور حیۃ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے معلوم ہو گیا کہ وہاں جان کا لفظ کس معنی میں آیا ہے، دوسرے لفظ جان معنی شاعری میں مستعمل ہے

نکال کر دیکھ لیجیے جن میں "جن" اور "انس" کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں کسی جگہ بھی آپ کوئی اشارہ ایسا نہ پائینگے جو انس کے عام اور جن کے خاص ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ جہاں کہیں جن اور انس کے الفاظ معطوف و معطوف علیہ کی حیثیت سے آئے ہیں، وہاں حرف عطف نہ تو عطف العام علی الخاص یا عطف الخاص علی العام کے طور پر آیا ہے، اور نہ عطف الشئ علی مرادفہ کے طور پر۔ ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کے عطف کا حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ سامع کو پہلے سے اس کا علم ہو کہ معطوف و معطوف علیہ میں سے ایک عام ہے اور دوسرا خاص، یا دونوں مرادف ہیں۔ مثلاً رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ میں سامع خود سمجھ سکتا ہے کہ عطف، عطف العام علی الخاص کے قبیل سے ہے۔ یا وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ میں صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے۔ یا نافی قولہ کذباً و میناً میں عطف کا عطف الشئ علی مرادفہ کے قبیل سے ہونا ہر وہ شخص جانتا ہے جو "کذب" اور "مین" کے معنی سے واقف ہے۔ پس جب جن وانس میں یہ تینوں صورتیں نہیں ہیں تو لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ ان دونوں کے درمیان واو عطف مطلق معیت کے لیے ہے۔ کیونکہ لغت سے یا عرف سے یا کسی قرینۂ عقلی سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص یا ترادف کا تعلق ہے۔ اگر قرآن کی اصطلاح خاص میں ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص کا تعلق ہوتا، اور پھر بغیر کسی تصریح کے وہ ان دونوں کے درمیان محض واو عطف استعمال کرتا تو یہ اس کے بیان کا نقص ہوتا۔ اس مقصد کے لیے اس کو کم از کم الانس والجن منہم ہی کہنا چاہیے تھا کہ سامعین کو معلوم ہو جاتا کہ جن کے نام سے جس گروہ کو یاد کیا جا رہا ہے وہ لغت اور عرف عام کے خلاف، انسانوں ہی کا ایک گروہ ہے۔

لیکن ہم کو عطف و معطوف کی بحث میں بھی پڑنے کی ضرورت نہیں۔ مدعی کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں جن اور انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد انسانوں

ہی کا ایک طبقہ ہے۔ اب آپ ان تمام آیات کو پڑھ جائیے جن میں یہ دونوں لفظ یک جا استعمال ہوئے ہیں اگر خود انہی میں متعدد آیتیں آپ کو ایسی مل جائیں جن میں ان دونوں گروہوں کی مغایرت صاف نظر آتی ہو تو مدعی کا دعویٰ آپ باطل ہو جائیگا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵: ۳)	ہم نے انسان کو کالے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا اور اُس سے پہلے جنوں کو ہم نے لُو کی گرمی سے پیدا کیا تھا۔
خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵: ۱)	اس نے انسان کو ٹھیکری کی طرح کی بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لو سے۔
فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ (۵۵: ۲)	پس اس روز اس کے گناہ کی بابت نہ کسی انسان سے پوچھا جائیگا اور نہ کسی "جن" سے۔
لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (۵۵: ۳)	ان سے پہلے اُن حوروں کو نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا اور نہ کسی جن نے۔
كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲: ۱)	انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے۔
وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ۔ بَلْ كَانُوْا	جس روز اللہ تعالیٰ اُن سب کو جمع کریگا پھر ملائکہ سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہیں کو پوجا کرتے تھے؟ وہ عرض کرینگے تو پاک ہے ہمارا ولی تو ہے نہ کہ یہ۔ دراصل یہ لوگ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی پرستش کیا کرتے تھے اور

يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۔(۵:۳۴)۔

ان میں سے اکثر درحقیقت انہی پر ایمان رکھتے تھے۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (۵:۳۷)۔

اور انہوں نے خدا کے اور جنوں کے درمیان رشتہ جوڑ رکھا تھا۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ اَوْلِيٰٓـُٔهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (۵:۶)۔

اور جس دن خدا ان سب کو جمع کریگا تو فرمائے گا اے گروہ جن تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنے دام میں گرفتار کرلیا۔ اور انسانوں میں سے جو اُن کے دوست ہیں وہ کہیں گے کہ پروردگار ہم میں سے بعض نے بعض سے خوب فائدہ اٹھایا اور اب ہم اس مدت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔

ان آیات سے کیا ثابت ہو رہا ہے؟ یہ کہ جن اور انس دو الگ اور متبائن الحقیقت گروہ ہیں؟ یا یہ کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا ایک جز ہے؟

دوسری دلیل دوسری دلیل جس میں آپ اور مولانا اسلم جیراج پوری متفق ہیں، یہ ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت کو جو حسب تصریح قرآن "جن" ہیں، اللہ تعالیٰ نے غیر مرئی بیان کیا ہے۔ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷:۳) بخلاف اس کے حضرت سلیمان کے پاس جو جن تھے، وہ نظر آتے تھے اور انسانوں کے سے کام کرتے تھے۔ لہٰذا حضرت سلیمانؑ والے جن وہ آتشیں جن نہیں ہیں، بلکہ انسان ہیں۔

اس کے جواب میں بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ والے جنوں کے متعلق

قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ نظر آتے تھے، انسانی شکل میں تھے، اور حضرت سلیمانؑ کے علاوہ عام لوگ بھی ان کو دیکھتے تھے لہذا قرآن کی جو آیت آپ پیش فرما رہے ہیں وہ اُن آیات کے خلاف نہیں ہے جن میں حضرت سلیمان والے جنوں کا ذکر آیا ہے۔ رہا آپ کا یہ گمان کہ وہ انسانوں کے سے کام کرتے تھے، تو یہ بھی قرآن سے ثابت نہیں۔ قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح پانی میں غوطے لگاتے تھے، یا انسانوں کی طرح برتن اور عمارتیں بناتے تھے، یا انسانوں کی طرح باندھے جاتے تھے۔ وہاں تو مطلقاً غواصی اور ظروف سازی اور معماری وغیرہ کا ذکر ہے، اور محض اس ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ غواصی وغیرہ انسانوں کی سی غواصی وغیرہ تھی، تاوقتیکہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ غواصی بغیر اس طریقے کے ممکن نہیں ہے جس طریقہ سے انسان غوطہ لگاتا ہے، اور ظروف سازی وغیرہ امور انہی طریقوں میں منحصر ہیں جنہیں انسان استعمال کرتے ہیں۔ اگر محض یہ بات کہ جو فعل انسان کرتا ہے وہ کسی ہستی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یہ حکم لگانے کے لیے کافی ہو کہ وہ ہستی لامحالہ انسان ہی ہونی چاہیے، تو ایک شخص نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ کو انسان کہہ سکتا ہے، کیوں کہ قرآن میں بعض وہ افعال جو انسان کرتے ہیں، خدا کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ مثلاً بولنا۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر اس پہلو سے قطع نظر کر کے یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ انسانوں کی طرح نظر آتے تھے، اور انسانوں ہی کی طرح وہ سب افعال کرتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے، تب بھی جو آیت آپ پیش فرما رہے ہیں اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس گروہِ مخلوقات سے خارج تھے جو نظر نہیں آتا، اس لیے کہ کسی مخلوق کا ایسا ہونا کہ وہ انسان کو نظر نہ آئے، اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کا نظر آنا ممکن ہی نہ ہو، اور بطورِ خرقِ عادت بھی وہ نظر نہ آسکے۔ قرآن مجید میں شیاطین جن کے غیر مرئی ہونے کی صفت تو صرف ایک ہی جگہ بیان ہوئی ہے۔ مگر ملائکہ

کی اس صفت کا متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے مثلاً

اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ (۸: ۶)	یعنی شیطان نے اپنے اولیاء سے کہا کہ میں فرشتوں کی وہ فوجیں دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں۔
فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا (۹: ۶)	پھر اللہ نے اپنی سکینت اُس پر اتاری اور ایسے لشکروں سے اس کی تائید کی جن کو تم نہ دیکھتے تھے۔
وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا (۹: ۴)	اور وہ لشکر اُتارے جن کو تم نہ دیکھتے تھے۔
اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا (۳۳: ۲)	جب تم پر فوجیں حملہ آور ہوئیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور وہ لشکر بھیجے جو تم کو نظر نہ آتے تھے
یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ (۲۵: ۳)	جس روز یہ لوگ ملائکہ کو دیکھیں گے اس روز مجرموں کی خیر نہ ہوگی۔

اس کے باوجود متعدد مواقع پر قرآن مجید ہی نے بیان کیا ہے کہ ملائکہ انسانی شکل میں آئے ہیں، نہ صرف انبیاء بلکہ عام انسانوں تک نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان بہت سی مستثنیٰ مثالوں کو دیکھ کر آپ نے ملائکہ کے متعلق بھی کیوں نہ کہہ دیا کہ ان سے مراد بھی انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے؟ غیر مرئی ہونے میں دونوں برابر۔ انسانی شکل میں ظاہر ہونے کے واقعات ملائکہ میں متعدد اور جنوں میں صرف ایک باوجود اس کے تعجب ہے کہ آپ ملائکہ کے متعلق تو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بطور معجزہ و خرق عادت بار بار وہ انسانی صورت اختیار کرتے رہے ہیں لیکن جنوں کے متعلق اس قسم کا ایک واقعہ سن کر آپ کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ حضرت سلیمانؑ کی غیر معمولی دعا کو قبول کر کے جس طرح اللہ تعالیٰ نے

خرق عادت کے طور پر ہوا اور پرندوں کو اُن کے تابع کیا تھا اور اُن کو جانوروں کی بولیاں سکھائی تھیں، اُسی طرح بطور خرق عادت اس نے جنوں کو بھی مرئی اور محسوس بنا دیا ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس آپ قرآن کی تمام تصریحات اور لغت عرب کے خلاف یہ تاویل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ صرف اس خاص موقع پر انسانوں کو "جن" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور مولانائے جیراج پوری تو اس ایک مثال سے فائدہ اٹھا کر انسانوں کی ایک مستقل قسم کا نام ہی جن فرض کر لیتے ہیں درآں حالیکہ اس کے لیے کوئی قوی ثبوت اُن کو قرآن سے نہیں ملا اور اس کے خلاف قرآن مجید کی صریح آیات اور کلام عرب کی واضح شہادتیں موجود ہیں۔ اتنی بڑی ذمہ داری کا بار اٹھانے سے پہلے کیا اس بات پر غور کر لینا بہتر نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک غیر مرئی مخلوق کو مرئی بنا دینا کونسا ایسا مستبعد اور محال امر ہے کہ اس سے بچنے کے لئے اتنی مشقت اور اتنے تکلف کی حاجت پیش آئے؟ جب آپ نے ملائکہ جیسی لطیف مخلوق کا مرئی ہو جانا مان لیا تو شیاطین جیسی کثیف مخلوق کے مرئی ہو جانے میں آپ کو اتنا استبعاد کیوں محسوس ہوتا ہے؟ قرآن مجید میں جنوں کی جو کچھ حقیقت بیان کی گئی ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک آتشیں مخلوق ہیں لیکن جبریل فرشتے کے متعلق تو یہ کہا ہے کہ وہ "روح" اور وہ بھی روح اللہ ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹:۲)۔	پھر ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو بھیجا اور وہ اس کے سامنے اچھے خاصے آدمی کی شکل میں نمودار ہوئی۔
وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (۲۶:۱)۔	یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو لیکر روح الامین اترا ہے۔

جب "روح اللہ" جیسی مجرد از عوارض مادہ شئے کا باذن الٰہی مرئی ہو جانا ممکن ہے تو "نار السموم" جیسی چیز کا جو مادے اور مادی تکاثف سے قریب تر

لیے، جسمیت اختیار کر لینا کیوں ناممکن یا لبعید از عقل وقیاس ہے کہ اس سے بچنے کی خاطر قرآن میں تاویلات بعیدہ کا دروازہ کھولا جائے۔ قرآن کی رو سے تو صرف باری تعالیٰ ہی کی ذات ایسی ہے کہ انسان کی نگاہیں اس دنیا میں اس کو نہیں دیکھ سکتیں، لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (۶: ۱۳) اور قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ (۷: ۱۷) یہ صفت بالذات صرف خدائے تعالیٰ کے لیے ہے۔ باقی جتنی مخلوقات ہیں ان میں سے کسی کے لئے بھی یہ صفت بالذات نہیں ہے۔ البتہ بعض کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ عادۃً وہ نظر نہیں آتیں لیکن اگر خدا چاہے تو وہ اس پر قادر ہے کہ خواہ اُن کو مرئی کر دے یا ہماری نظروں کو اتنا تیز کر دے کہ ان کی لطیف تر صورتوں کو دیکھ سکیں۔

تیسری دلیل آپ نے اور مولانا اسلم جیراج پوری نے اس بات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس جو غوطہ خور اور معمار وغیرہ تھے ان کو "شیاطین" کہا گیا ہے۔

لہ۔ جنوں کی تخلیق جس آگ سے ہوئی ہے وہ میرے نزدیک وہ آگ نہیں ہے جو کیمیاوی استحالات سے مادی اجسام میں پیدا ہوتی ہے، بلکہ وہ ایک خاص طور کی آگ ہے ہماری ان مادی آگوں سے مختلف۔ چونکہ انسانی زبان میں اس کو تعبیر کرنے کے لیے "نار" سے زیادہ اقرب کوئی لفظ نہ تھا، اس لئے حق تعالیٰ نے اس کو اس لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے مراد وہ شعاع نہیں ہے جو مادی نیرات سے نکلتی ہے، بلکہ ایک غایت درجہ مجرد اور منزہ حقیقت ہے جس کے تصور سے انسان کے ذہن کو روشن کرنے کے لیے لفظ "نور" سے زیادہ اقرب اور کوئی لفظ نہیں۔ تاہم اگر آپ کی یہ رائے مان لی جائے کہ "جن" اسی مادی آگ کے بنے ہوئے ہیں جو عناصر اربعہ میں سے ایک ہے، تو روحانی فرشتوں کے مقابلہ میں ان مادی جنوں کا مرئی محسوس بن جانا تو اور بھی زیادہ قریب از عقل وقیاس ہے۔

اور شیاطین کا اطلاق جنوں کی طرح انسانوں پر بھی کیا گیا ہے، اس لئے آپ کہتے ہیں کہ ان معماروں اور غوطہ خوروں کو ان کے مرئی ہونے اور انسانوں کے سے کام کرنے کی بنا پر شیاطین الانس کیوں نہ سمجھا جائے؟

اس کو دلیل کے بجائے میں صرف غلط فہمی کہوں گا۔ اوّل تو قرآن مجید میں حضرت سلیمانؑ کے کاریگروں اور خادموں کے لیے صرف شیاطین ہی کا لفظ نہیں آیا ہے بلکہ "جن" کا لفظ بھی آیا ہے، مثلاً

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ (۲۷ : ۲)۔

اور سلیمان کے لئے اس کے لشکر از قسم جن و انس و پرند جمع کیے گئے۔

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ...... يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ...... فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ (۳۴ : ۲)۔

اور جنوں میں سے جو اس کے (یعنی حضرت سلیمانؑ) کے آگے اس کے رب کے اذن سے کام کرتے تھے ..... جو کچھ وہ چاہتا وہ اس کے لیے بناتے تھے، بڑی بڑی عمارتیں، اور مورتیں اور لگن کی طرح کے حوض اور ایک جگہ جمی رہنے والی بھاری دیگیں ..... جب ہم نے سلیمانؑ پر موت کا فیصلہ کر دیا تو ان کو اس کی موت کی خبر جس چیز نے کی وہ کچھ اور نہ تھا محض زمین کا کیڑا تھا جو سلیمان کے عصا کو کھا رہا تھا جب سلیمان گر پڑے تب ان جنوں پر یہ راز کھلا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اتنی مدت تک اس ذلت غلامی کے عذاب میں نہ رہتے۔

ص ۵۶
لہ۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں "جن" کے ساتھ انس کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ (بقیہ نوٹ صفحہ ۵۶ ملاحظہ ہو)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ غوطہ خور اور معمار شیاطینِ جن کی قسم سے تھے، شیاطین الانس نہ تھے۔

دوسرے یہ بات آپ کی اور مولانا کی نظر سے پوشیدہ رہ گئی کہ قرآن مجید میں کہیں مطلقاً الشیطان اور الشیاطین بول کر انسان مراد نہیں لئے گئے ہیں، بلکہ ابلیس اور اس کی ذریت مراد لی گئی ہے۔ ہاں اگر کہیں انسانوں کے کسی گروہ کے لیے شیاطین کا لفظ بطور صفت استعمال کیا گیا ہے، تو ایسے ہر موقع پر صراحتہً یا کنایتہً یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہاں شیاطین سے مراد انسان ہیں جیسے، جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ (۶: ۴) اور وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ (۲: ۲)۔

ایمان بالکتاب کا مقتضیٰ اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کوئی ایسی قوی دلیل موجود نہیں ہے جس کی بنا پر سیدنا سلیمان علیہ السلام کے قصے میں، یا کسی دوسرے مقام پر لفظ "جن" کے معنی متعین کرنے میں اُس معنی سے انحراف کرنا جائز ہو جس کی تصریح خود قرآن مجید متعدد مواقع پر کر چکا ہے۔ اور جب ایسا نہیں ہے تو کسی شخص کے لیے جو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان رکھتا ہو، یہ جائز نہیں کہ جس کو خدا نے "جن" کہا ہے اور آدمی نہیں کہا اس کو وہ اپنے قیاس سے

یہ جن وہ جن تھے جن کو غیب دانی کا گھمنڈ تھا۔ انہی جنوں میں سے ایک گروہ بعد میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سن کر اپنے دوسرے ہم قوموں سے کہتا ہے کہ اب ہمارے غیب دانی کے وسائل ہم سے چھن گئے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَشُهُبًا وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَن يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا (۷۲: ۱)۔

اس آیت میں غیب کی خبریں حاصل کرنے کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ انسان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی کجا کہ کوئی انسان اس پر قادر ہو۔

آدمی کہہ دے۔ ایسا قیاس کرنے کے لیے اگر کوئی سبب داعی ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ عادت جاریہ جس کا مشاہدہ اور ادراک کرنے کے ہم خوگر ہیں، اُن واقعات کے خلاف ہے جو بعض مواقع پر قرآن مجید میں جنوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں لیکن اسی طرح آگ کا ایک خاص شخص کے لیے سرد ہو جانا، لکڑی کا ایک خاص موقع پر اژدہا بن جانا، دریا کا ایک خاص وقت میں پھٹ کر راستہ دے دینا، ایک شخص کا مٹی کے پرند بنا کر اُن میں جان ڈال دینا اور مردوں کو زندہ کر دینا، چند آدمیوں کا ایک غار میں ۳۰۹ برس تک پڑے سوتے رہنا اور پھر بھی زندہ رہنا، ایک شخص کا مرنے کے سو برس بعد جی اٹھنا اور اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو جوں کا توں بالکل تازہ حالت میں پانا، ایک شخص کا ساڑھے نو سو برس تک زندہ رہنا اور وہ بھی یوگ کی مشقوں سے نہیں بلکہ ایک منکر قوم کے مقابلہ میں تبلیغ دین کی تھکا دینے والی مشقتوں کے ساتھ، یہ اور ایسے ہی متعدد واقعات ہیں جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں اور سب اُس عادت جاریہ کے خلاف ہیں جس کو دیکھنے کے ہم خوگر رہے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو خدائے علیم و خبیر اور قادر و توانا کا کلام نہ مانیں، تو ہمارے لیے ان واقعات کی تاویل ہی کرنے کی ضرورت نہیں، محض اس بنیاد پر ہی ان سب کو جھٹلایا جا سکتا ہے کہ ایسا ہوتے ہم نے کبھی نہیں سنا اور نہ دیکھا۔ اور اگر ہم یہ مان لیں کہ قرآن اُس خدا کا کلام ہے۔ جو ازل سے ابد تک عالم وجود کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا حقیقی علم رکھتا ہے، اور خدا وہ خدا ہے جس کے معجزے ہم کو سورج اور سیاروں، اور زمین، اور خود اپنے وجود میں ہر آن نظر آ رہے ہیں، تو ہمیں کسی غیر معمولی اور خلاف عادت واقعہ کو بعینہٖ اُسی طرح تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا جس طرح وہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ یہ واقعات تو کیا چیز ہیں، اگر قرآن میں کہا گیا ہوتا کہ ایک وقت میں چاند کو ماؤنٹ ایورسٹ پر لا کر رکھ دیا گیا تھا، اور کسی وقت خدا نے سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکالا تھا، تب بھی ایک مومن صادق کو اس بیان کی صداقت میں ایک لمحہ کے لیے شک نہ ہو سکتا تھا، اور نہ کسی طرح تاویل کر کے اس کو عادتِ جاریہ کے مطابق

ثابت کرنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اس لئے کہ یہ کائنات جس کی وسعت کا تصور کرنے سے ہمارا دماغ تھک جاتا ہے اور اس کائنات کی ہر شئے حتیٰ کہ گھاس کا ایک تنکا اور کسی جانور کے جسم کا ایک بال بھی اپنی پیدائش میں درحقیقت اُتنا ہی حیرت انگیز اور اعجاز نما ہے جتنا چاند کا ایورسٹ پر آجانا اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ ایک قسم کے واقعات کو دیکھنے کی ہمیں عادت ہوگئی ہے، اس لیے ہم کو اُن کے معجزہ ہونے کا شعور نہیں ہوتا، اور دوسری قسم کے واقعات شاذ ہیں اس لیے اُن کی خبر جب ہم کو دی جاتی ہے تو ہمیں اچنبھا ہوتا ہے اور ہماری عقل جو صرف مشاہدات و تجربات پر اعتماد کرنے کی خوگر ہوگئی ہے ان کو باور کرنے میں جھجکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے واقعات کے متعلق جب ہم کو کوئی خبر دی جائے تو ہمیں حق ہے کہ ان کے وقوع کے متعلق قابل وثوق شہادت طلب کریں لیکن ایک مومن کے لیے قرآن سے بڑھ کر قابل وثوق شہادت اور کوئی نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ کتاب خدا کا کلام ہے، اور خدا کے فعل پر خود خدا ہی کی شہادت سب سے زیادہ معتبر ہے۔ البتہ جو شخص قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک رکھتا ہو اس کو حق ہے کہ قرآن کے ہر بیان میں شک کرے، خواہ وہ عادت جاریہ کے موافق ہو یا مخالف۔ (باقی)